# اردو کا مکتوباتی ادب ''مرزا غالب تا نواب مرزا داغ دہلوی

محمد طارق *
شاہد الدین **
سید عامر عالم رضوی ***

''المکتوب نصف الملاقات'' عربی کی مثل مشہور ہے اس ملاقات کو نصف سے بڑھا کر روبرو کی سی ہم کلامی اور مخاطبت عطا کرنے کا سہرا مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کے سر ہے۔ غالب کی مکتوب نگاری سے اُردو ادب کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا جس نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس مقالے میں انیسویں صدی کی نصف آخر میں غالبؔ سے داغؔ تک مختلف قلم کاروں کے اسلوبِ مکتوب نگاری کا تجزیہ کیا گیا ہے جس کی روشنی میں مکتوباتی ادب کے ابتدائی اور ارتقائی خدوخال نمایاں ہو سکیں گے۔

افسانوی، داستانوی، تنقیدی اور شعری ادب کی طرح اُردو کا مکتوباتی ادب بھی اپنی جگہ بڑا اہم، وسیع اور افادی نوعیت کا حامل ہے۔ یوں تو مکتوباتی ادب کا نام آتے ہی بے شمار ادبا کے نام ہمارے سامنے آجاتے ہیں تاہم اس ضمن میں غالبؔ، سرسیدؔ، حالیؔ، شبلیؔ، اکبر الٰہ آبادیؔ، مولوی عبدالحق، علامہ اقبالؔ، مہدی افادی اور مولانا ابوالکلام آزاد نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ مکتوب نگار کے ذاتی و نجی حالات اور اس کے زمانے اور ماحول کے اہم واقعات و حالات کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت و کردار کا اصل اور واضح نقش پوری طرح اُبھر کر سامنے آجاتا ہے جو کہ اس ادیب کی دیگر نوعیت کی تخلیقات میں دکھائی نہیں دیتا۔ اسی سبب سے ہم مکتوبات کو کسی ادیب یا شاعر کی آپ بیتی کا اصل اور بنیادی ماخذ قرار دے سکتے ہیں۔

یوں تو مکتوبات سرکاری، کاروباری اور نجی نوعیت کے بھی ہوتے ہیں لیکن جو اہمیت، افادیت اور مقبولیت علمی و ادبی طرز کے خطوط کو حاصل ہے وہ اپنی جگہ مسلم ہے۔ رفیع الدین ہاشمی نے اپنی کتاب اصناف ادب میں مولوی

* ریسرچ اسکالر، سابقہ مدیر اعلیٰ اردو لغت بورڈ، مقیم کراچی
** ریسرچ اسکالر، اردو لغت بورڈ کراچی، مقیم کراچی
*** ریسرچ اسکالر، انسٹی ٹیوٹ آف بزنس مینجمنٹ کراچی، مقیم کراچی

عبدالحق کی رائے اس طرح نقل کی ہے:

> خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ بعض اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے، جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے۔[1]

گویا اظہار کا جو بے ساختہ پن ہمیں مکتوبات میں نظر آتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں ادیبوں نے مکتوب نگاری کے جوہر دکھائے ہیں اور اپنے مکاتیب میں اپنی ذات اور اپنے زمانے کے حقائق پر سے جس طرح پردہ ہٹایا ہے اس کی مثال پیش نہیں جا سکتی۔ اگر دیکھا جائے تو یہ مکتوبات ایک لحاظ سے تاریخی اور ادبی اہمیت رکھتے ہیں۔

اُردو میں جب خطوط نویسی کی بات آتی ہے تو ہماری نظر فوراً مرزا غالبؔ کے خطوط کی طرف جاتی ہے جن کے خطوط اپنے مکالماتی اور ظریفانہ انداز کے باوصف اُردو ادب میں ایک اہم اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ مرزا کے خطوط کا پہلا مجموعہ عودِ ہندی کے نام سے ممتاز علی خاں میرٹھی نے مطبعِ مجتبائی میرٹھ سے ۲۷ □ اکتوبر ۱۸۶۸ء میں شائع کیا۔ دوسرا مجموعہ اُردوئے معلّٰی کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوا۔ پہلی جلد ۶ □ مارچ ۱۸۶۹ء میں (یعنی غالبؔ کی وفات کے انیس (۱۹) دن بعد) اور اس جلد کی دوسری اشاعت مطبعِ اکمل المطابع دہلی سے ۱۱ □ فروری ۱۸۹۱ء میں ہوئی جب کہ تیسری اشاعت مولانا حالیؔ کی فرمائش پر مطبعِ مجتبائی دہلی سے ۱۸۹۹ء میں ہوئی جس میں دوسری جلد کو بھی شامل کر دیا گیا۔ ایک اور مجموعہ مکاتیبِ غالب کے نام سے ۱۹۳۷ء میں امتیاز علی صاحب عرشی ناظم کتب خانۂ رام پور نے شائع کیا جس میں مرزا غالبؔ کے والیانِ رام پور کے نام تحریر کردہ مکتوبات شامل ہیں۔ ادبی خطوطِ غالبؔ کے نام سے ایک مجموعہ جسے جناب مرزا عسکری مؤلف: ''تاریخِ ادب اُردو'' نے ترتیب دیا اور انوار المطابع لکھنؤ سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ ان تمام خطوط میں غالبؔ نے زیادہ تر نکات و مسائلِ علمیہ کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ اشعار کے معنی اور شعرا سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ چھیانوے (۹۶) خطوط پر مشتمل اس مجموعے میں ایک ضمیمہ بھی شامل ہے جس میں غالبؔ کے بعض مکتوب الیہم کے نام اور ان کے حالات بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ ان کے نام خطوط عودِ ہند اور اُردوئے معلّٰی میں بھی غالبؔ نے تحریر کیے ہیں۔ ایک اور مجموعہ منشی مہیش پرشاد نے خطوطِ غالب کے نام سے ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد سے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا۔ دوسری جلد کی اشاعت سے قبل ہی وہ دنیا سے چل بسے۔ مولانا غلام رسول مہر نے منشی صاحب کے انتقال کے بعد غالبؔ کے خطوط مرتّب کر کے خطوطِ غالب کے نام سے ۱۹۵۱ء میں لاہور سے شائع کیے۔ غالبؔ کے خطوط کا ایک اور مجموعہ

مکاتیبِ الغالب کے نام سے جناب مولوی حاجی حافظ سید شاہ علی احسن صاحب احسنؔ مارہروی نے ترتیب دیا اور اس پر مقدمہ بھی لکھا۔ یہ مجموعۂ مکاتیبِ غالب علی گڑھ بک کمپنی نے شائع کیا لیکن اس کتاب پر کوئی سن نہیں ڈالا گیا نہ ہی مقدمے پر کوئی سن تحریر کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ ۸۸ (اٹھاسی) خطوط پر مشتمل ہے اور اس میں بقول مرتّب اُردوئے معلّٰی کی پہلی اور دوسری جلد میں شامل خطوط میں سے کچھ خطوط کو شامل کیا گیا ہے۔ ''خطوطِ غالب کے نام سے ۱۹۸۴ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے ایک اور مجموعہ ڈاکٹر خلیق انجم نے مرتّب کر کے شائع کیا۔

غالبؔ نے مکتوب نگاری میں القاب و آداب اور دیگر تکلّفات سے گریز کرتے ہوئے برسوں پرانے اور روایتی انداز کو ترک کر کے سیدھے سادے انداز میں بے تکلّفانہ اندازِ تحریر کی روایت کی بنیاد ڈالی۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے دوست میر زا حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> میر زا صاحب میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔[۲]

۱۸۵۷ء کا خونی معرکہ اور اس کے نتیجے میں مسلمانانِ ہند کو انگریزوں کے ہاتھوں جس ظلم و ستم سے دوچار ہونا پڑا وہ ہماری تاریخ کا ایک نہایت افسوس ناک اور دلِ ہلا دینے والا باب ہے۔ خود غالبؔ کس طور کی زندگی بسر کر رہے تھے، انھیں کن معاشی مسائل کا سامنا تھا، اس زمانے کے سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی حالات کیسے تھے، مسلمانوں کی حکومت کا زوال، انگریزوں کی حکومت کا قیام، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی شکست اور پھر ردِّ عمل کے طور پر انگریزوں کے مسلمانوں پر مظالم، مغلیہ دور اور تہذیب کا خاتمہ غرض یہ تمام باتیں غالبؔ نے اپنے مخصوص انداز اور منفرد اسلوب میں اس طرح بیان کی ہیں کہ یہ خطوط ایک تاریخی نوعیت اختیار کر گئے ہیں جنھیں کبھی بھی اور کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا غلام رسول مہر غالبؔ کے خطوط کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

> یہ خطوط اُردو زبان میں گوناگوں اسالیبِ بیان کا ایک نہایت نادر اور دل کش مرقع ہیں۔ ان میں غالبؔ کی سوانحِ حیات کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ موجود ہے۔ ان میں غالبؔ کے دل و دماغ کی مکمل تصویر خود ان کے قلم سے تیار ہو کر سامنے آ گئی ہے اور یہ تصویر اس جامعیت سے نہ ان کے کلیاتِ نظمِ فارسی میں ملتی ہے نہ کلیاتِ نثرِ فارسی میں اور نہ اُردو دیوان میں جو ہمارے یہاں ان کی یگانہ شہرت کا شہپرِ پرواز ہے۔[۳]

مثلاً غالبؔ کے یہ خطوط ملاحظہ ہوں !

مرزا قربان علی بیگ خاں سالک کو لکھتے ہیں کہ !

میری جان، کن اوہام میں گرفتار ہے؟ جہاں باپ کو پیٹ چکا اب چچا کو بھی رو۔ خدا تجھ کو جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورتِ وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصوّر کیا ہے۔ جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جُوتی لگی۔ بہت اِتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تُو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے غالب کیا مرا بڑا مُلحد مرا، بڑا کافر مرا۔ نجم الدولہ بہادر''(۱) ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حُرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اُکسو، کچھ تو بولو''۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔[۴]

اپنی مرگ کا طالب، غالب

(۱۱□ جولائی ۱۸۶۴ء)

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں کہ !

سیّد صاحب!

میاں، کیا باتیں کرتے ہو؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں، جاڑے آتے ہیں لحاف توشک کی فکر ہے کتابیں کیا چھپواؤں گا۔[۵]

غالب

(۱۸۵۸ء)

نواب یوسف میرزا کو لکھتے ہیں کہ !

یوسف میرزا!

''میرا حالِ سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؟

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا۔ اس کی بیٹی، اس کے چار بچے، اس کی ماں یعنی میری بھاوج جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہو گی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور

امرا کے ازواج اور اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں! اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔ اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کلوہ کلیان، ایاز یہ باہر کے، مداری کی جوُرو بچے بدستور۔ گویا مداری موجود ہے۔ یہاں گھمسن گئے گئے مہینا بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں۔ بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقامِ معلوم (یعنی رام پور) سے کچھ آئے جاتا ہے وہ بقدرِ سدِ رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں، بُھوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں؟ بڑھاپا، ضعفِ قویٰ، اب مجھ کو دیکھو تو جانو میرا کیا رنگ ہے؟ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں گویا صاحبِ فراش ہوں نہ کہیں جانے کا ٹھکانہ، نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق (شراب) جو بقدرِ طاقت بنائے رکھتا تھا اب میسر نہیں۔ سب سے بڑھ کر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار میں جاتا تھا، خلعتِ فاخرہ پاتا تھا، وہ صورت اب نظر نہیں آتی، نہ مقبول ہوں، نہ مردود ہوں، نہ گنہ گار ہوں، نہ مُخبر، نہ مُفسد۔ بھلا اب تم ہی کہو اگر یہاں دربار ہوا اور میں بلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں؟[۶]

والسلام خیر ختام

(۲۸□ نومبر ۱۸۵۹ء)

اپنی زندگی کے حالات اور اپنے مسائل کے تذکرے کے ساتھ ساتھ غالب نے اپنے خطوط میں ۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب (غدر) سے متعلق بھی اپنے دِلی جذبات و محسوسات کو بڑے موٴثر انداز میں بیان کیا ہے۔ انقلاب ستاون کی رُوداد اور دِلی کی تباہی کی داستان غالب نے اپنے خطوط میں اس طرح بیان کی ہے کہ اس وقت کے حالات پوری طرح آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ مثلاً مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ!

'' اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں''۔[۷] (۵□ دسمبر ۱۸۵۷ء)

غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں کہ!

اس فتنہ و آشوب میں تو کوئی میرا جاننے والا نہ بچا ہوگا۔ اس راہ سے مجھ کو جو دوست اب باقی ہیں بہت عزیز ہیں۔ واللہ! دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں تو کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو۔[۸] (اپریل ۱۸۵۸ء)

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں کہ!

دِلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پُل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں نہیں، پھر کہو دِلی کہاں؟ ہاں، کوئی شہر قلمروِ ہند میں اس نام کا تھا۔[9] (۲ دسمبر ۱۸۵۹ء)

انور الدّولہ شفق کو لکھتے ہیں کہ!

میں نہیں جانتا کہ ۱۱ □ مئی ۱۸۵۷ء کو پہر دن چڑھے وہ فوجِ باغی میرٹھ سے دہلی میں آئی تھی یا خود قہرِ الٰہی کا پے بہ پے نزول ہوا تھا۔ بقدرِ خصوصیتِ سابق دِلی ممتاز ہے ورنہ سر تا سر قلمرو ہند میں فتنہ و بلا کا دروازہ باز ہے۔[10] (۲۴ □ اگست ۱۸۶۰ء)

غالب نے جہاں سادہ اور بے تکلف نثر کو رواج دیا وہیں ان کے زمانے میں پر تکلف نثر نگاری کے اسلوب کے نمائندے رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب کی تخلیق کے بعد انشائے سرور کے نام سے خطوط کا ایک مجموعہ پیش کیا۔ ان خطوط کے مطالعے سے سرور کی مقفع و مسجع نثر، ان کی پُر تکلف زبان اور ان کی ادبی مرصع کاری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور یہ چیز واجد علی شاہ کے نام تحریر کیے گئے خطوط میں بطورِ خاص دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً اُن کا یہ خط ملاحظہ فرمایئے۔

شاہنشاہِ کشورِ وفاداری، ادیب و دبستانِ دل فریبی و جفاکاری، موجد ناز و نیاز، معشوق فراموش، عاشق نوازِ کج کلاہی کی دھوم رہے زمانہ محکوم رہے۔ شکایتِ فراق میں دفتر سیاہ ہوئے حکایتِ سوزشِ اشتیاق کے پروانے گواہ ہوئے، گو تحریر کا سلسلہ صبح و شام جاری ہے لیکن ہاتھ اور قلم عاری ہے، ناکام ہے۔ ناچار ہاتھ اوٹھایا (اُٹھایا) مدّعا طرازی، مطلب براری پر آیا۔ محبت نامہ سینہء محرور کو مرہم کافور کا ہوا، سبب دل کے سرور اور باعث آنکھوں کے نور کا ہوا۔ ہاتھوں سے اُس کی بلائیں لیں دل سے تم کو دعائیں دیں۔

فرشِ گُلِ تر، خار سے بدتر، نشتر سے تیز ہے، وحشت اب جنوں خیز ہے۔ تمھیں کچھ اس کی دوا کرو ہماری حاجت روا کرو و گرنہ دل و جگر دونوں کا ناحق خون ہوتا ہے ہر دم کے گھٹنے سے حال زار و زبوں ہوتا ہے۔ ان سب پہ طُرہ یہ ہے کہ سر جلے یا گردن کٹے تمھاری لو لگی ہے۔ گھر میں بیٹھے سر گراں ہوں زُلف کی صورت پریشان ہوں، تمھاری تاک ہے لطفِ زندگی خاک ہے، دن رات کا کھٹکا ہے دم لبوں پہ اٹکا ہے، پہروں در و دیوار سے سر پٹکا ہے یہ کہہ کے پکارا ہے کہ جانِ عالم ہم مرتے ہیں دنیا سے گزرتے ہیں، تمھارا دم بھرتے ہیں اور کون ہمارا ہے۔''

فقط

اپنے بیٹے کو خط لکھتے وقت پُر تکلف نثر نہیں بلکہ سیدھی سادی عبارت میں گفتگو کرتے ہیں اور بڑے دل نشین پیرائے میں دنیا کے نشیب و فراز سمجھاتے ہوئے ہدایات اور نصیحتیں کرتے ہیں۔ ان خطوں کا انداز اور اسلوب ان کے دوسرے خطوط سے قطعاً مختلف ہے۔ مثال کے طور پر بیٹے کو اس طرح خط لکھتے ہیں!

نورِ چشم راحتِ جاں سعادت واقبال نشاں مد اللہ عمرہ' ومزید قدرہ'!

بعد دعائے صحت وسلامت اور دیکھنے کی تمنا کے کہ عالم الغیب اس سے آگاہ ہے کشش دل گواہ ہے۔ واضح خاطر ہو وقتِ روانگیِ گونڈہ جو خط تم نے بھیجا تھا وہ آیا مگر اس کا منتظر تھا کہ تمھارا وہاں داخلہ اور مقام قیام جو دریافت ہو تو خط لکھے لہٰذا ۲۳ تاریخ محرم کی اور یکم اگست پنج شنبے کا دن تھا کہ دوسرا خط تمھارا آیا۔ خدا شاہد ہے کہ جیسی مسرّت حاصل ہوئی پروردگار تم کو ہمیشہ سوا اپنے کسی کا محتاج نہ کرے۔ انشاءاللہ عنقریب ترقی ہوگی۔ ہر چند کہ تمھاری طینت اور طبیعت کا حال مجھ کو خوب معلوم ہے کہ تمھارے نزدیک دوسو چار سو کی حقیقت کچھ نہیں۔ یہ گروہ جو حاکم ہیں ان کو اس بات کی کداز حد رہتی ہے اور جو تقدیر میں ہوتا ہے وہ بہر کیف ملتا ہے بلکہ

گر نہ ستانی بہ ستم می رَسد

رزّاقِ مطلق نے ہر فرد بشر کی روزی وجہِ حلال سے قسمت کی ہے۔ اگر طمعِ حرام نہ کرے بذریعۂ حلال پہنچے گی۔ کوئی بندہ نہیں مرتا جب تک اپنا پورا رزق کھا نہ چکے آئندہ سمجھ لینا کہ دوسرے پیادے یا جمع دار نائب کو توال جو تحتِ حکومت ہوں ان سے یا آشتی اور نرم زبان سے پیش آنا کہ یہ رام رہیں بندۂ بے دام رہیں۔ کارپرداز کو چار کام ضرور اختیار کرنا چاہیے۔ اوّل سرکار کو اپنے حسنِ انتظام اور خیر خواہی کے التزام سے راضی رکھے۔ دوسرے جھوٹ فریب سے اجتناب کرے۔ تیسرے شعلۂ چشم وغضب کو آبِ حلم وبُردباری سے بجھاتا رہے۔ حرص وطمع کو نفس پر غالب نہ ہونے دے۔ حادثہ پیش آئے اس میں ثابت قدم رہے۔ چوتھے جس طرح اپنے نوکر سے امید نمک حلالی اور وفاداری کی رکھے اسی طرح سرکار کا کام انجام دے۔

تمام سن میں اِس وقت خدا جانے کیا جی میں آیا جو یہ کلمے تم کو لکھے اس واسطے کہ اب ہم چراغِ سحری ہیں، بہت سی باتیں لکھنے کے لایق نہیں، جو خدا نے باہم کیا تو موقوف بملاقات ہیں مگر خدا کے واسطے مہینے کے بعد خط تو لکھتے رہنا کہ وہ تسکین کا باعث ہوگا۔ [۱۲]

زیادہ دعا

بقول ڈاکٹر انور سدید!

سرور کے خطوط میں دوسرے شخص کو رازداں بنانے کی خواہش، شخصی باتوں میں جذبے کی ذاتی آمیزش، سادہ نثر میں ہلکی سی نمکینی اور موضوع کی طرف پیش قدمی سے غالبؔ کے اسلوب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔[۱۳]

مولوی حامد حسن قادری، خواجہ غلام غوث بے خبرؔ کی کتاب انشائے بے خبر پر مقدمہ لکھتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ !

اس میں شک نہیں کہ اُردو خطوط کی دل کشی اور بے تکلفی کا سہرا غالبؔ کے سر ہے لیکن غالبؔ اس کے موجد نہیں ہیں، موجد و زمانہء ایجاد کا صحیح تعین دشوار ہے لیکن قیاس ہے کہ ممتاز مکتوب نگاروں میں جن کو متقدمین کہا جا سکتا ہے وہ مرزا رجب علی بیگ سرور، مرزا غالبؔ اور خواجہ غلام غوث بے خبرؔ ہیں بلکہ خواجہ صاحب کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ انھوں نے اُردو خطوط نویسی ۱۸۵۰ء سے پہلے شروع کی ہے جب کہ مرزا غالبؔ کا کوئی اُردو خط ۱۸۵۰ء سے پہلے کا نہیں ہے۔ ''خواجہ غلام غوث بے خبر کے خطوط کا مجموعہ فغانِ بے خبر کے نام سے ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا تھا یعنی خواجہ صاحب کی زندگی میں اور دوسرا مجموعہ رشکِ لعل و گوہر ان کے بعد ۱۹۰۸ء میں طبع ہوا۔ اگر خواجہ صاحب کے خطوط کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں ہمیں مکتوب نگاروں کی جملہ خصوصیات پائی جاتی ہیں مثلاً ان کا یہ خط ملاحظہ فرمایئے۔[۱۴]

منشی ممتاز علی خاں کا نام خط لکھتے ہیں !

جناب۔ مرزا نوشہ صاحب کی نثر کا مجموعہ مرتّب کر کے آج مصنف صاحب کے حوالے کیا ہے۔ غازی الدّین حسین خاں صاحب کے پاس بھیج دیں اور وہ آپ کی خدمت میں روانہ کریں۔ مصنف آپ کے بہت قریب ہیں ایک نظر ان کو بھی دکھا لیجیے تب چھپوانا شروع کریں تو بہتر ہے۔ فقیر نے اس کے ترتیب دینے اور لکھوانے اور بذاتِ خود مقابلہ کرنے ہی میں محنت نہیں کی بلکہ اتنا تردد اور کیا کہ جو رقعات بریلی سے آئے ہوئے تھے لکھوا دیے۔ ان کو وہاں سے مکرر منگوایا اور سوائے اس کے گور کھپور، لکھنؤ اور کان پور سے کچھ بہم پہنچایا اور نئی نثریں مصنف سے اور لیں اور ان سب کو بھی مجموعے میں داخل کیا اور جہاں کہیں شک ہوا مصنف سے اس کی تصحیح کرالی۔ اب اگر یہ مجموعہ طاقِ نسیاں پر رکھا نہ رہے اور جلد چھپے تو مصنف پر احسان ہوگا۔ فقیر کے پاس تو اصل موجود ہے جب دیکھے گا کہ آپ نہیں چھپواتے تو اپنے کاتب سے ایک نسخہ اور لکھوا لے گا اور جو جو نقل کے طالب ہوں گے ان کو دے دے گا۔[۱۵] (صفحہ ۱۰۲، ۱۰۳، انشائے بے خبر)

مکتوبات کی اہمیت اور افادیت اُس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ان میں لکھنے والے کی نجی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے واقعات کی جھلک بھی نظر آئے۔ مثال کے طور پر سر سید احمد خاں کے مکتوبات جن میں برِ صغیر کے مسلمانوں کی حالتِ زار، ان کی تعلیمی پستی، ہندوؤں اور انگریزوں کا مسلمانوں کے ساتھ ذِلت آمیز برتاؤ اور پھر مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام کی کوششیں، مسلمانوں کی دُنیوی ترقی اور فلاح و بہبود کی غرض سے شروع کی جانے والی اسکیمیں یہ تمام باتیں بیان کی گئی ہیں۔ سر سید احمد خاں کے مکتوبات کا ایک مجموعہ خطوطِ سر سید کے نام سے سید راس مسعود صاحب المخاطب بہ نواب مسعود یار جنگ بہادر ناظمِ تعلیمات سرکارِ آصفیہ حیدر آباد نے مرتّب کیا جو نظامی پریس بدایوں نے ۱۹۲۴ء میں شائع کیا۔ ایک اور مجموعہ مکتوباتِ سر سید کے نام سے شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے سید عابد علی عابد کی زیرِ نگرانی ترتیب دیا جسے مجلسِ ترقیِ ادب لاہور نے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔ ایک لحاظ سے سر سید کے یہ خطوط ہندوستان کے پچاس سال کے علمی، مذہبی، معاشرتی اور سیاسی واقعات و حالات کی دستاویز ہیں جو بلاشبہ تاریخی اور ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے ذاتی اخلاق و عادات کے ساتھ ساتھ ان کی سیرت و کردار اور عقائد و خیالات کی بہترین عکاسی ان خطوط کے ذریعے ہوتی ہے نیز ان کے مذہبی عقائد اور بہت سے فکری رویوں کے بارے میں جو غلط فہمیاں عام ہو گئی تھیں ان خطوط کے توسط سے بڑی حد تک دور ہو جاتی ہیں۔ سر سید کے مذہبی عقائد اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے قیام اور اس میں انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم دینے کے منصوبے پر ان کے زمانے کے بڑے بڑے علما نے ان کی پُر زور مخالفت کی اور مختلف اخبارات میں ان کے مذہبی عقائد اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے قیام کی مذمت کی مگر سر سید نے ان مخالفتوں کی کوئی پروا نہیں کی اور قومی ترقی و فلاح کے کاموں کو جاری رکھا۔ مثلاً اُن کے یہ خطوط ملاحظہ ہوں!

بخدمت ایڈیٹر صاحب پنجابی اخبار، لاہور۔

''صاحبِ من! آپ نے اپنے اخبار مطبوعہ ۲۰ □ جولائی میں جو آرٹیکل نسبت مدرسۃ العلوم کے بنظر قومی ہمدردی کے لکھا اس کا میں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور اجازت چاہتا ہوں کہ چند لفظ (اس کے متعلق) آپ کی خدمت میں لکھوں۔

میں اپنے اُن نامہربان دوستوں کا جو میری ذاتی مخالفت پر سر گرم ہیں اور گو کہ وہ ان باتوں میں جو میری ذات سے علاقہ رکھتی ہیں کتنا ہی مبالغہ کرتے ہیں اور لوگوں کو مغالطہ دیتے ہیں اور بے سر و پا اِتہام کرتے ہیں ہمیشہ ممنون رہا ہوں اور رہوں گا۔ ان کا ناراض ہونا اور غصے میں آکر حد سے تجاوز کر جانا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ ان کے خیالات

میرے خیالات سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ میرے خیالات (کو) مذہبی لحاظ سے کفر و الحاد و زندقہ و ارتداد سمجھتے ہیں (گو فی نفسہٖ کیسے ہی عمدہ ہوں)۔ پھر اُن کی مخالفت سے اگر میں آزُردہ ہوں تو میری نادانی ہے۔

مدرسۃ العلوم کوئی میرا ذاتی کام نہیں ہے۔ جہاں تک میری سمجھ ہے میں اس کو اپنی قوم کے لیے فائدے مند سمجھتا ہوں اور جو کچھ اس میں کوشش کی جاتی ہے وہ قومی کام ہے۔ پس مدرسۃ العلوم سے مخالفت کرنا البتہ مجھے تعجب میں ڈالتا ہے اور قومی ادبار پر افسوس آتا ہے۔ اگر وہ مخالفت رائے کے اختلاف پر مبنی ہوتی اور جو کارروائی مدرسۃ العلوم میں ہوتی ہے اس میں نقص نکالے جاتے اور اصلاح پر دی جاتی تو (میرے لیے) اس سے زیادہ کوئی خوشی کی بات نہ تھی مگر جب وہ اس میں کچھ نقص نہیں پاتے تو غلط بیانی اور بہتان بندی اور اتہام سے کام لیتے ہیں اور اس پر نہایت فخر کرتے ہیں۔ بلاشبہ جھوٹا موتی آب و تاب میں زیادہ ہوتا ہے مگر کب (کتنے) دن کا؟ جھوٹا پھر جھوٹا ہی ہے۔ دو دن بعد نہ وہ آب و تاب (رہتی) ہے نہ وہ چمک دمک''۔[۱۶]

راقم، سید احمد

(علی گڑھ، ۲۴ جون ۱۸۸۱ء)

مخدوم و مکرم من جناب مولوی عبدالحق صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ!

بعد سلام مسنون عرض یہ ہے کہ آپ نے جو عنایت نامہ میرے نام سید الاخبار دہلی، نمبر ۱۷ میں چھاپا ہے اُس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اُس کے جواب میں یہ عرض ہے کہ آپ جو یہ استفسار فرماتے ہیں کہ مدرسۃ العلوم مسلماناں میں (وہ) کون سے علوم ہوں گے جن سے اہلِ اسلام ترقیِ دنیا حاصل کریں گے؟ تو (اس کے جواب میں عرض ہے کہ) اگر آپ ازراہِ عنایت اُس طریقۂ تعلیمِ مسلماناں پر غور فرمائیں گے جو کمیٹی میں پیش ہوا ہے اور ہمراہ پرچۂ تہذیب الاخلاق مطبوعہ ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ تقسیم ہوا ہے تو آپ کو ان سب علوم کا جو مدرسۃ العلوم مسلماناں میں پڑھانے تجویز ہوئے ہیں بخوبی حال معلوم ہو جائے گا اور اُس وقت آپ یہ رائے قائم فرما سکیں گے کہ ان علوم کے پڑھنے سے دین اور دنیا دونوں میں ترقی ہونے کی اُمید ہے یا نہیں؟

آپ نے تصور فرمایا ہے کہ مدرسۃ العلوم کی تعلیم سے (مقصد) ہاتھ آنا سرکاری نوکریوں کا اصلی مقصود ہے اس لیے آپ فرماتے ہیں کہ سرکار میں اتنی نوکریاں کہاں ہیں جو مسلمانوں کو دے گی؟ جنابِ من! آپ نے مقصودِ مدرسۃ العلوم پر غور نہیں فرمایا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان علوم و فنون میں ایسی تعلیم پا جائیں کہ بلا ذریعہء نوکری خود اپنی قوتِ بازو سے اپنی معاش پیدا کریں اور جو کہ مدارسِ سرکاری میں بجز نوکری پیشہ بننے کے یہ بات حاصل نہیں ہوتی اس لیے مستقل مدرسے کے قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے''۔[۱۷]

راقمِ آثم، سید احمد

(از بنارس، ۵ نومبر ۱۸۷۳ء)

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ :

> سر سید جس طرح نثر میں مدعا اور مقصد کے داعی ہیں اسی طرح خط نگاری میں بھی مقصد ہی کے علم بردار ہیں۔ ان کے خط ان کی عام نثر کے مقابلے میں زیادہ شگفتہ ہیں، ان میں قدرے ایجاز بھی مد نظر رہتا ہے۔ ان کے خطوط اور مضامین کے درمیان کچھ مسافت ہے مگر زیادہ نہیں کیوں کہ ان کے خط بھی پیغام کی حدوں سے متجاوز ہو کر تبلیغ و خطابت تک جا پہنچتے ہیں۔ بہر حال یہ مسلم ہے کہ سر سید نے اُردو خط نگاری کو مضمون کی قطعیت، زبان کی سادگی اور تخاطب کے خلوص سے آشنا کیا اور یہی چیز ان کے اکثر رفقا کے خطوں میں پائی جاتی ہے۔[۱۸]

مولوی نذیر احمد کے مکتوبات بھی ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ یہ خطوط موعظۂ حسنہ کے نام سے ۱۸۸۷ء میں قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوئے۔ مکتوبات کے اس مجموعے کو پروفیسر محمد عبدالغفور شہباز نے مرتّب کیا۔ یہ مکتوبات ڈپٹی نذیر احمد نے اعظم گڑھ، حیدر آباد اور دہلی سے اپنے بیٹے بشیر الدّین احمد کو لکھے تھے۔

نذیر احمد کے مکتوبات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں نصیحت و ہدایت کے ساتھ ساتھ درس و تدریس اور خانگی نوعیت کے مسائل، زبان، قواعد، املا و انشا کے نکات اور تعمیر و تشکیل و اصلاحِ سیرت و کردار پر زور دیا گیا ہے۔ انھوں نے ان مکتوبات کے ذریعے اپنے بیٹے کے دل میں حصولِ علم کی سچی لگن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ابتدائی دور کے خطوط سے قطعِ نظر بعد کے خطوط میں انھوں نے اپنے بیٹے کی زندگی سے متعلق دیگر نوعیت کے مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے مکتوبات کی ایک مشترکہ خصوصیت بے تکلف اور سادہ انداز میں ہر بات اس طرح بیان کرنا ہے کہ وہ پڑھنے والے کے دل میں اُتر جائے۔ کہیں لہجہ اور انداز مشفقانہ اور دوستانہ ہے تو کہیں بزرگانہ، ناراضگی و برہمی کا عنصر بھی موجود ہے۔ وعظ و نصیحت کی فضا تمام مکتوبات پر چھائی ہوئی ہے۔ مثلاً اُن کے یہ خطوط ملاحظہ ہوں۔

ایک خط میں اپنے بیٹے کو لکھتے ہیں کہ !

'' بشیر۔ خدا کے لیے اب پورا پورا شوق کرو۔ دو تین برس کی محنت ہے بڑا مرحلہ انٹرنس کا ہے۔ اگر تم اس میں کامیاب ہوئے تو یہ کامیابی اگلے امتحانوں میں تمھاری مددگار ہو گی۔ علم تو سب طرح کے ہیں اور طالبِ علم کو لازم ہے کہ سب طرف برابر توجہ کرے لیکن سب پر مقدم ادب ہے جس کو انگریزی میں لٹریچر کہتے ہیں یعنی زبان دانی۔ کمالِ

زبان دانی یہ ہے کہ تم کو اہلِ زبان کی سی قدرت حاصل ہو۔ اس کی تدبیر یہ ہے کہ زبان دانوں کی عبارتیں یاد ہوں۔ جس طرح کے خیال اور مضمون کو جس پیرائے میں اہلِ زبان نے ادا کیا ہے اس کی تقلید اور اس کی نقل کرنی چاہیے۔ غرض زبان دانی کے لیے یادداشت شرط ہے۔ محاورات اور امثال و حکایات اور لُغت اور صلوں کا استعمال جن کو تم پری پوزیشن کہتے ہو سب پیشِ نظر رہیں۔ جس تحقیق سے تم مجھ سے عربی پڑھتے تھے کہ ہر ہر لفظ کا مادّہ اور ماخذ اور صیغہ اور ترکیب کوئی بات چھوٹنے نہیں پاتی تھی یہی تحقیق فارسی اور انگریزی کُل زبانوں میں ہے۔ جب کسی کتاب کا سبق لے کر بیٹھو خود لفظ لفظ پر نظر کرتے جاؤ۔ جب اسی انضباط سے دو چار کتابیں نکلیں اچھی خاصی استعداد ہو جائے گی۔ اپنے حالاتِ جزوُ کل سے ہمیشہ مطلع رکھو۔[19]

والدعا

(۵ جنوری ۱۸۷۶ء)

ایک اور خط میں اپنے بیٹے کی ازدواجی زندگی کی بہتری کے خیال سے اسے اس طرح نصیحت کرتے ہیں کہ !

تم کو ایک مدت تک بی بی کو تعلیم کرنا پڑے گا۔ اس خصائص مزاجی پر غور سے نظر کرتے جاؤ۔ یہ اُسی کے حق میں مفید ہو گا کہ بیوی، صاحب کے اختیار میں اس طرح رکھی جائے جیسے بیمار طبیب کے اختیار میں۔ کبھی کچھ پھٹا اُدھڑا سلا کر دیکھو کہ اس ہنر میں اُس کی دست گاہ کہاں تک ہے، کسی طرح ممکن ہے کہ کسی حیلے سے کھانا پکانے میں بھی اس کا امتحان لیا جائے اور جس بات میں کوتاہی پائی جائے نرمی اور مہربانی سے اُس کو سمجھا دیا جائے۔[20]

فقط

(۱۸۷۹ء)

اپنے بیٹے کے نام ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ !

''اب تمھارے مزاج میں ایک کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے کہ تم کو نصیحت بُری لگتی ہے لیکن نصیحت کرنا میرا اختیارِ لازمی ہے۔ تمھاری دھمکی سے میں اپنا اختیار چھوڑ نہیں سکتا۔ اگر میری نصیحت تم نہیں مانتے نہ مانو لیکن بابِ نصیحت کا مفتوح رہنا تمھارے حق میں اچھا ہے''۔[21]

فقط

(۵ جولائی ۱۸۷۷ء)

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

''ان (نذیر احمد) کی زندگی کے بہت سے واقعات خصوصاً حیدر آبادی زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں معلومات کا سب سے زیادہ معتبر و مستند ذریعہ یہی خطوط ہیں۔ اس اعتبار سے ان چند برسوں کے خطوط کی سوانحی قدر و قیمت اس قسم کے بعض ضخیم مجموعوں سے کہیں زیادہ ہے۔ موعظۂ حسنہ میں نذیر احمد کے اسلوب کے تمام بنیادی نقوش واضح طور پر نظر آتے ہیں لیکن اظہار و بیان میں اختصار کی خصوصیت ان خطوط کا ایک امتیازی وصف ہے''۔[۲۲]

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کے مکتوبات بھی ان کی دیگر تصانیف مثلاً آبِ حیات، دربارِ اکبری، نیرنگِ خیال، اور سخندانِ فارس ہی کی طرح اہمیت کے حامل ہیں۔ مکتوباتِ آزاد کے نام سے ایک مجموعہ سید جالب دہلوی کا مرتب کردہ ہے اور دوسرا آزاد کے پوتے آغا طاہر کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ یہ تمام خطوط میجر ڈاکٹر سید حسن بلگرامی کے نام لکھے گئے ہیں۔ جب شیخ عبدالقادر صاحب نے مولانا محمد حسین آزاد کے مختلف لوگوں کے نام تحریر کیے ہوئے خطوط لوگوں سے ازراہِ اشاعت طلب کیے تو میجر سید حسن بلگرامی نے تقریباً تیس بتیس خطوط شیخ عبدالقادر کو بھیجے جو انھوں نے رسالہ مخزن کے مختلف شماروں میں قسط وار شائع کیے۔ بعد میں انھیں مکتوباتِ آزاد کے نام سے ۱۹۰۷ء میں کتابی شکل میں چھاپا۔

اس پر دیباچہ مصوّرِ فطرت خواجہ حسن نظامی کا لکھا ہوا ہے۔ مولانا آزاد کے خطوط کے بارے میں خواجہ صاحب تحریر کرتے ہیں کہ:

'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آمنے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فقرے، موثّر، آسان اور سمجھ میں آنے والے الفاظ، عرصہ ہوا تھوڑا سا حصہ مخزن پریس نے چھاپا اور بہت اہتمام سے شائع کیا تھا اب آزاد کے پوتے مُلّا طاہر نے جدید مکتوبات جمع کیے ہیں جو اب تک شائع نہیں ہوئے تھے، اِن کی اشاعت سے دادا جان کی روح کو مسرور اور ملک کے پیاسوں کو سیراب کرنا چاہتے ہیں۔ مکتوباتِ آزاد قومی تعلیم کے مکاتب و مدارس میں نصاب کے طور پر پڑھائے جائیں تو لڑکوں کو لکھنے اور ایک دوسرے کو مخاطب کرنے اور دل کا مطلب صحیح طور سے ادا کرنے کا سلیقہ ہو جائے۔ مکتوباتِ آزاد کو گھر گھر میں پھیلنا چاہیے تاکہ بچے اور عورتیں ان کو پڑھیں اور شروع سے ان کو معلوم ہو جائے کہ اُردو زبان ایسی ہوتی ہے''۔[۲۳]

محمد حسین آزاد ایک صاحبِ طرز انشاپرداز تھے۔ ان کی انشاپردازی کا حسن اور کمال جہاں ان کی دیگر تخلیقات میں دل کشی اور دلآویزی پیدا کرتا ہے خطوط میں پوری طرح جلوہ نما ہے۔ زبان کی شیرینی اور ادبی رنگینی ان خطوط کی جان ہے اور یہی خصوصیت آزاد کے خطوط کو بلند ادبی رتبہ عطا کرتی ہے۔ مثلاً اُن کے یہ خطوط ملاحظہ ہوں۔

عالی جنابِ من زاد اللہ اجلالکم۔ تسلیم۔

''احمق کا قاعدہ ہے کہ اپنی تعریف سُن کر خوش ہوتا ہے۔ میرا یہ حمق حد سے بہت گزر گیا ہے کہ تعریف سُن کر غصہ آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ میری تصنیف کے باب میں کچھ نہ کہا کریں۔ کیا کہوں فرصت تو ہے نہیں اور دل یہ چاہتا ہے کہ آپ کے ایک ایک فقرے کے جواب میں ایک ایک کتاب لکھوں۔

میں نے سخندانِ فارس کو نظرِ ثانی کر کے رکھ دیا ہے۔ چاہا کہ اب دربارِ اکبری کو سنبھالوں مگر مروّت اور حمیت نے اجازت نہ دی کیوں کہ استاد مرحوم شیخ ابراہیم ذوق کی بہت سی غزلیں، قصیدے بے ترتیب پڑے ہیں اور میں خوب جانتا ہوں کہ ان کا ترتیب دینے والا میرے سواد نیا میں کوئی نہیں۔ اگر میں اس باب میں بے پروائی کروں گا تو یہ ان کی محنت کا نتیجہ جو دریا میں سے قطرہ رہ گیا ہے بے موت مر جائے گا اور اس سے زیادہ افسوس کا مقام کیا ہو گا؟ اور اس میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جس جس قصیدے یا غزل یا شعر کے موقعے پر کوئی تقریب، معاملہ یا معرکہ پیش آیا تھا وہ بھی نقل کروں کیوں کہ میں ہر وقت کا حاضر باش تھا۔ آج تک کسی شاعر کا دیوان ایسا مرتب نہ ہوا ہو گا۔ خدا انجام کو پہنچا دے''۔ [۲۴]

آزاد

(یکم ستمبر ۱۸۸۸ء)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ !

عالی جنابِ من دام اجلالکم:

''تسلیم۔ عنایت نامہ باعثِ اعزاز ہوا۔ آپ کی تحریر کا جواب فرصت چاہتا ہے۔ مجھے کہاں؟ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ مآثر الامرا اور سوانح اکبری کسی زمانے میں دیکھی تھیں۔ چند مقاموں میں پرانی کتابوں کا پتا لگا تھا۔ ۶ دن میں بھاگ گیا اور دوڑا دوڑا آیا جو کچھ ہاتھ لگا اسے دیکھتا گیا اور یادداشتیں لیتا گیا۔ مآثر الامرا بھی مل گئی۔

دیباچہ لکھنے کی نوبت ابھی کہاں آئی۔ خدا وہ دن کرے۔ دو صورتیں یہ کہ ایک تو وہی معمولی طریقے کہ ایک نسخہ پہلے ممدوح کو بھیجا اور استمزاج کیا۔ ممدوح نے منظور فرمایا مصنف نے شکریہ ادا کیا۔ دوسری صورت کا مضمون آئینۂ خیال میں ایک تصویرِ موہوم ہے اور اس وقت فرصت مفقود۔ اچھا میں خلاصہ قلم بند تو کرتا ہوں۔ اس کا مضمون یوں تصور فرمایئے کہ جب اس موقعے پر آب و رنگ اپنی دستکاری خرچ کر چکے تو عالمِ بالا کے پاک نہاد زمین پر اُتر آئے۔ دسوں عقلیں، پانچوں حواس غور و فکر و ہم خیال وغیرہ وغیرہ سے انجمن منعقد ہوئی۔ مانی و بہزاد کی روحوں نے اس کے سامنے ادب سے سر جھکایا۔ پہلا امر یہ پیش ہوا کہ یہ دربار کہاں سجایا جائے۔ سب نے دوربینیں اُٹھائیں اور شش جہت

میں نگاہیں دوڑائیں۔ کہیں موقعے کی جگہ نظر نہ آئی مگر وہ ایوانِ عالی شان وغیرہ وغیرہ۔ وہم نے اعتراض کیا کہ جب تک ممدوح سے اجازت نہ حاصل ہو ایسی جسارت زیبا نہیں۔ آزاد نے کہا سحر کا نور، شفق کی سرخی، صبح کا عالم جب نظر آتا ہے اہلِ دل کہتے ہیں سبحان اللہ۔ صبا و نسیم پھولوں کی شمیم لاتی ہے۔ دل کہتا ہے صلِ علیٰ۔ اس میں آفتاب سے اجازت اور اس میں خسروِ گل سے استمزاج کون کرتا ہے۔ میں نے ایسا ممدوح یہاں پایا اسی کے دامنِ اقبال سے وابستہ کیا وغیرہ وغیرہ۔ اسے سب نے تسلیم کیا۔ اب غائبانہ عرض کرتا ہوں کہ وغیرہ وغیرہ۔

''میری دانست میں یہ بھی ایک نیا مضمون ہے اور اس میں کچھ ہرج نہیں''۔[۲۵]

محمد حسین عفی عنہ، آزاد

(لاہور، مستی دروازہ، ۲۶ ستمبر ۱۹۰۶ء)

مولانا شبلی کے تحریر کردہ مکتوبات کی علمی و ادبی لحاظ سے بیش بہا اہمیت ہے۔ سید سلیمان ندوی نے مولانا شبلی کے انتقال (۱۹۱۴ء) کے بعد ان کے مکتوبات کا مجموعہ مکاتیبِ شبلی کے نام سے دو جلدوں میں ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں شائع کیا۔ یہ تمام خطوط انھوں نے اپنے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کو لکھے ہیں۔ ان دو مجموعوں کے علاوہ محمد امین زبیری نے ایک اور مجموعہ خطوطِ شبلی بہ نام عطیہ بیگم صاحب فیضی اور زہرا بیگم صاحب فیضی کے نام سے ترتیب دیا جو ۱۹۲۶ میں پہلی بار شائع ہوا۔ پہلے مجموعے کے ختم ہو جانے کے بعد تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور نے اس مجموعے کو ۱۹۳۵ء میں دوبارہ شائع کیا۔

مولانا شبلی کے مکتوبات میں طوالت کے بجائے اختصار پایا جاتا ہے۔ ان میں سادگی اور سلاست ہے۔ کسی قسم کے پُر تکلف انداز یا مقفع و مسجع عبارت آرائی سے گریز ملتا ہے۔ شبلی کے مکتوبات میں کہیں کہیں طنزیہ پیرایۂ بیان بھی دکھائی دیتا ہے۔ اپنے زمانے کے سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی حالات و واقعات اور اپنے ماحول کی صورتِ حال پر کہیں کہیں مایوسی کا اظہار بھی ملتا ہے۔ کسی جگہ ان مکتوبات میں ان کی ناقدانہ طبیعت کی واضح جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ کسی جگہ وہ اپنے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کو علمی و اصلاحی نوعیت کے مشورے بھی دیتے نظر آتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اُن مسائل کا ذکر بھی ہے جس سے اُس وقت ملک و قوم دوچار تھی۔ ایک اہم خصوصیت شبلی کے مکتوبات کی یہ ہے کہ وہ ہر شخص سے اس کے مذاق، رجحان اور دل چسپی کے پیشِ نظر گفتگو کرتے ہیں۔ اگر کوئی شاگرد خط لکھتا ہے تو اسے علمی و اصلاحی مشورے دیتے ہیں۔ اگر کوئی بڑی علمی شخصیت علمی و فکری مسائل چھیڑتی ہے تو پھر گفتگو عالمانہ سطح پر ہوتی ہے۔ مولوی حبیب الرحمن خان شروانی، پروفیسر عبدالقادر، مولانا حمید الدّین، جناب مہدی حسن مصنف دائرۂ ادبیہ کے نام خطوط اسی ضمن میں آتے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک خط ملاحظہ ہو۔

مولانا حمید الدّین صاحب کو لکھتے ہیں !

''برادرم!

خط پہنچا۔ میں اسی قسم کے خطوط کی تم سے خواہش رکھتا ہوں اور اسی لیے نہایت خوشی سے جواب لکھتا ہوں۔ اشعارِ جاہلیت مدت سے ہوئی میری نظر میں ہیں لیکن میں نے ان پر چنداں توجہ نہیں کی۔ یہ اشعار ایسے ماخذوں سے جمع کیے گئے ہیں مثلاً اغانی وغیرہ جن میں ضعاف اور موضوعات تک ہیں البتہ ناقد خود صحیح اور موضوع کی تمیز کر سکتا ہے۔

نظام القرآن کا میں شوق سے خیر مقدم کروں گا۔ ابو مسلم ہی ایک شخص ہے جو دل و دماغ رکھتا ہے۔ وہ معتزلی ہے۔ اس کی تفسیر بارہ جلدوں میں تھی اور رازی کی تفسیر سے پہلے اسی کا نام کبیر تھا۔ میں نے اس کا کسی قدر حال اپنی نئی تصنیف علم الکلام میں لکھا ہے جو ابھی شائع ہوئی ہے۔ اس کا پورا نام محمد بن علی بن مہریزد ہے، ۴۵۷ھ میں وفات کی، بہت بڑا ادیب و معقولی تھا۔

ابنِ خلکان کی طرح اور رجال کی کتابیں بھی مختصر ہیں صرف طبقات الشافعیہ ابن السبکی میں کسی قدر مفصل تراجم ملتے ہیں لیکن وہ اب تک چھپی نہیں یہاں اس کا نسخہ موجود ہے۔ طبقات الاطباء بھی غنیمت ہے اور وہ پانچ روپے کو آتی ہے۔

مسٹر آرنلڈ کی کیا فرمایش تم نے تعمیل کی؟ نیشنل اسکول کے متعلق آج ہی لکھتا ہوں۔ میں نے علم الکلام نہایت ناقص کتاب لکھی اور وہ درحقیقت میری تصنیفات کا سب سے ناقص حصہ ہے۔ جدید علم الکلام غالباً اچھا لکھا جائے، بہت کچھ ہو چکا۔ عنقریب ہی ابنِ رشد کی لایف لکھنا چاہتا ہوں۔'' [۲۶] والسلام

شبلی

(۹ مارچ ۱۹۰۳ء، حیدر آباد)

اصل میں مولانا شبلی نعمانی خالصتاً روایتی مولوی نہیں تھے باوجود اس کے کہ ان کا تعلق ندوۃ العلما سے تھا اور وہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مؤلف بھی تھے اور انھوں نے الفاروق، المامون، سیرۃ النعمان اور سوانحِ مولانا روم جیسی عظیم سوانح عمریاں تحریر کیں لیکن وہ دیگر علما کی طرح نہ تنگ نظر تھے اور نہ ہی کہنہ خیال۔ انھیں اُس زمانے میں عورتوں کے مسائل اور ضرورتوں کا بہ خوبی احساس تھا اور وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اُس زمانے کی عورتوں میں اپنے ماحول اور سماج کے حالات کے تناظر میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہییں۔ جب وہ بمبئی کے مشہور و معروف خاندان، خاندانِ فیضی سے متعارف ہوئے تو اس خاندان کی خواتین عطیہ بیگم اور زہرا بیگم سے بہت متاثر

ہوئے جو اس وقت کے ہندوستان کی عام عورتوں کے مقابلے میں نہ صرف تعلیم یافتہ تھیں بلکہ حصولِ تعلیم کے لیے یورپ تک گئی تھیں۔ مولانا نے ان خواتین کو جو خطوط تحریر کیے وہ ان کی وفات کے بعد محمد امین زبیری مارہروی نے مرتّب کیے اور یہ پہلی بار ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئے۔ عطیہ فیضی کو ایک خط میں لکھتے ہیں!

''عزیزی!

''اصل یہ ہے کہ میں چاہتا تھا کہ میرے کام میں تمھارے نام کی شرکت ہو۔ اس کا اصلی طریقہ یہ تھا کہ کوئی تصنیف تمھارے نام ڈیڈیکیٹ کرتا لیکن افسوس نہیں کر سکتا۔ جن حالات میں گھرا ہوں تم سمجھتی اور جانتی ہو کہ اس سے دفعتاً اُن قومی کاموں کو نقصان پہنچ جائے گا جو میرے ہاتھ میں ہیں''۔[۲۷]

شبلی (۹ جون ۱۹۰۹ء)

زہرا بیگم فیضی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں!

''خاتونِ محترم! تسلیم و نیاز!

''میرا چھوٹا فارسی دیوان یعنی حال کی غزلیں چھپی ہیں اور میں نے ''برعکس نہند نام زنگی کافور'' ان کانٹوں کا نام دستۂ گل رکھ دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بھیج دوں لیکن زیادہ شوخ اور آزاد اشعار قلم سے نکل گئے ہیں اس لیے ان کا پردے ہی میں رہنا مناسب ہے''۔[۲۸]

والسلام

شبلی، ندوہ، لکھنؤ، ۲ مئی ۱۹۰۸ء

معین الدّین احمد انصاری صاحب مکتوباتِ شبلی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''شبلی کے وہ خطوط جو بیگماتِ فیضی کے نام ہیں زیادہ بے تکلف، بڑے پُر خلوص اور بے حد دل چسپ ہیں۔ اپنے خطوط میں وہ اُن تعلیم یافتہ خواتین سے بے انتہا متاثر ہیں۔ ان مکاتیب سے عورت اور عورت کے مسائل سے متعلق شبلی کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کی وسیع النظری اور روشن خیالی کا پتہ چلتا ہے''۔[۲۹]

غرض شبلی نعمانی کے یہ خطوط اس اعتبار سے اہم ہیں کہ ان میں کسی قسم کے تصنع یا بناوٹ کا گزر نہیں بلکہ یہ خطوط دراصل ان کے ذہن اور دل سے نکلنے والے سچے جذبوں اور احساسات کا مظہر ہیں اور ان میں مولانا کی شخصیت اور افکار و خیالات کا وہ رخ سامنے آجاتا ہے جو ان کی دیگر تصانیف میں دکھائی نہیں دیتا۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ کے مکاتیب کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا حالیؔ کے بیٹے خواجہ سجاد حسین نے اپنے والد کے مکتوبات مرتب کر کے دو جلدوں میں مکتوباتِ حالی کے نام سے ۱۹۲۵ء میں حالی پریس

پانی پت سے شائع کیے۔ ایک اور مجموعہ خواجہ سجاد حسین ہی کی ہدایت پر شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے ۱۹۵۰ء میں ''مکاتیبِ حالی'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔

مکتوباتِ حالی کے مطالعے سے مولانا کی عادتوں، ان کے مزاج اور طبیعت کی نرمی، انکساری، قلبی کشادگی اور شفقت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق ''مکتوباتِ حالی'' کے بارے میں اس طرح تحریر کرتے ہیں۔

''ان خطوط سے مولانا کی بعض عادتوں اور خصلتوں کا بھی پتا چلتا ہے اور جو لوگ ان سے ذاتی طور پر واقف نہیں وہ بھی انھیں پڑھ کر بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں کس قدر ہمدردی اور شفقت تھی۔ جب اپنے کسی عزیز یا دوست کو دیکھتے تھے کہ اس سے کچھ لغزش ہو گئی ہے یا کسی معاملے میں ضرورت سے زیادہ سخت ہے تو وہ اس قدر نرمی اور محبت سے سمجھاتے تھے یا اس کا پیرایہ ایسا اختیار کرتے تھے کہ سننے والے کو کبھی بُرا نہیں معلوم ہوتا تھا بلکہ ان کے کہنے کا اثر ہوتا تھا''۔[۳۰]

طبیعت کی نرمی و انکساری کے ساتھ ساتھ مکتوباتِ حالی میں کہیں کہیں ادبی نکات بھی اُٹھائے گئے ہیں۔ کسی نے اگر علمی و فکری نکتہ اُٹھایا یا کسی مسئلے اور معاملے کے بارے میں دریافت کیا تو مولانا نے بڑا معقول اور مدلل جواب دے دیا اکثر و بیش تر اپنے شاگردوں کو مشورۂ سخن بھی دیے ہیں۔ مکاتیبِ حالی میں مولانا حالیؔ نے نہ صرف اُردو بلکہ فارسی اور عربی میں بھی خطوط تحریر کیے ہیں اور ان خطوط میں وہی ادبی و علمی لیاقت اور شان نظر آتی ہے جو اُردو مکاتیب میں جلوہ گر ہے۔ مثلاً اُن کے یہ خطوط ملاحظہ ہوں۔

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی کو لکھتے ہیں!

''جنابِ من! لفظ ہاتھ میں بلاشبہ ہائے مخلوط ہے لیکن رات اور بات کا قافیہ بھی شعرا نے باندھا ہے۔ قافیے کی ضرورت ایسی ایسی خفیف فروگزاشتوں کو جائز کر دیتی ہے۔ مرزا غالبؔ کبھی اور کسی کی جگہ کبھو اور کسو کو غیر فصیح سمجھتے تھے لیکن ان کے اُردو دیوان میں قافیے کی جگہ کسو اور کبھو بندھا ہوا ہے۔ میں بھی ہمیشہ ہاتھ کو ہائے مخلوط کے ساتھ لکھتا ہوں مگر قافیے میں بات باندھنا جائز سمجھتا ہوں''۔[۳۱] زیادہ نیاز

خاکسار الطاف حسین حالیؔ

(از پانی پت محلہ انصاریاں ۶ فروری ۱۸۹۰ء)

مولوی عبدالحق کو ایک خط میں لکھتے ہیں!

پانی پت، ۲۶ اپریل ۱۹۰۹ء

''مکرمی مولوی صاحب! آپ کا محبت نامہ مدتِ دراز کے بعد پہنچا! آپ کی علالت کا حال معلوم ہونے سے نہایت افسوس ہوا۔ خدا صحتِ کامل عنایت فرمائے۔

عربی جمع کی تذکیر و تانیث کے متعلق یہ جواب ہے کہ بے شک اہلِ لکھنؤ تو عموماً اس کو بصورت جمع مذکر کے استعمال کرتے ہیں مگر جہاں تک میرا خیال ہے اہلِ دہلی خاص خاص الفاظ کے سوا ایسی جموع کو عموماً جمع موءنث کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ میرا خیال اس امر کی نسبت یہ ہے کہ بلاشبہ اہلِ دہلی بھی بعض جموعِ مؤنث کو جموعِ مذکر پر قیاس کر کے بصورت جمع مذکر استعمال کر جاتے ہیں۔ مثلاً حوادث و وقائع وغیرہ پر قیاس کر کے شدائد و مصائب اور فضائل و رزائل وغیرہ کو بھی بصورتِ جمع مذکر بول جاتے ہیں لیکن عام طور پر تمام جموع کی نسبت سرِ دست میرا یہ خیال نہیں ہے''۔[۳۲] والسلام مع الاکرام

خاکسارِ الطاف حسین عفی عنہ

اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں!

''برخوردار سعادت اطوار۔ سلمہم اللہ تعالیٰ!

بعد دعا کے مدعا یہ ہے کہ تمھارے کرنال چلے جانے کے بعد تمھاری نسبت ایسی افواہیں سنی گئی ہیں جو اوّل اوّل تو ہرگز باور نہ آتی تھیں مگر اب روز بروز ان کا یقین ہوتا جاتا ہے کہ تم اپنی ناعاقبت اندیشی سے کوئی ایسا فعل نہ کر بیٹھو جس کا تمام عمر تم کو پچھتاوا رہے۔ اگر بالفرض تم نے اسلام میں کوئی نقص یا عیب معلوم کیا ہے اور عیسائی مذہب کو تمام مذہبوں سے بہتر پایا ہے اور مذہبی تحقیقات کے جتنے مراتب ہیں وہ سب طے کر لیے ہیں اور بالکل تمھارے دل میں شک و شبہ باقی نہیں رہا تو بھی تم کو اپنا مذہب چھوڑنے اور دوسرا مذہب اختیار کرنے میں ایسی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔

یقین جانو کہ خدانخواستہ اگر یہ حرکت تم کر بیٹھے تو تم کو زندگی کاٹنی دشوار ہو جائے گی۔ نہ اپنی قوم میں تمھاری عزّت باقی رہے گی اور نہ وہ قوم جس کا مذہب اختیار کرو گے تم کو عزّت کی نظر سے دیکھے گی''۔[۳۳]

راقم، الطاف حسین عفی عنہ، از پانی پت

(۱۲ فروری ۱۸۹۷ء)

۱۸۵۷ء کے خونیں انقلاب کے نتیجے میں مسلمانانِ ہند کو انگریزوں کے ہاتھوں جن عبرت ناک اور انسانیت سوز مظالم کا سامنا کرنا پڑا اس نے مسلمانوں کے دِلوں اور ذہنوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ ۱۸۵۷ء کے اس خونی معرکے کے بعد مسلمانوں میں مایوسی اور غم ناکی کا اتنا شدید احساس پیدا ہوا جس نے ان سے جینے کا حوصلہ چھین لیا۔ ایسی مایوس کُن فضا میں سر سید احمد خان مسلمانانِ ہند کے لیے امید کی کرن بن کر چمکے۔ سر سید احمد خاں اور ان کے رفقائے کار نے

مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور اُنھیں ایک نئے عزم کے ساتھ پھر سے زندگی کے راستے پر ڈال دیا۔ سرسید احمد خان کے رفقائے کار میں ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی اور خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے علاوہ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک بھی شامل تھے۔ ان دونوں حضرات نے بھی اپنے زمانے کے حالات (خاص طور پر علی گڑھ کالج اور مدرسۃ العلوم) کے حوالے سے بہت سے خطوط تحریر کیے ہیں اس لیے ان دونوں حضرات کے خطوط بھی تاریخ اور اس وقت کے معاشرتی حالات کے تناظر میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

محمد امین زبیری مارہروی نے ان دونوں حضرات کے خطوط مرتّب کر کے دو حصوں میں شائع کیے ہیں۔ پہلے حصے میں نواب محسن الملک کے تحریر کردہ ساٹھ (۶۰) خطوط ہیں جو انھوں نے نواب وقار الملک اور دیگر حضرات کو مختلف اوقات میں لکھے۔ دوسرا حصہ نواب وقار الملک کے تحریر کردہ چھتیس (۳۶) خطوط پر مشتمل ہے۔ جو انھوں نے نواب محسن الملک اور دوسرے حضرات کو لکھے۔

اس مجموعہء مکاتیب کے مرتّب محمد امین زبیری مارہروی تحریر کرتے ہیں کہ !

''اُس دورِ جدید میں جو ۱۸۵۷ء کے پُر آشوب غدر سے شروع ہوتا ہے جن مشاہیرِ اسلام اور ہمدردانِ ملت نے قومی فلاح و بہبودی اور ہمدردی کے کاموں میں نہایت دل سوزی اور سرگرمی کے ساتھ اپنی بیش بہا زندگی صرف کی اور وقف کی ان میں سرسید مرحوم کے بعد نواب محسن الدّولہ محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں بہادر منیر نواز جنگ اور نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین خاں بہادر انتصار جنگ کی قابلِ احترام ہستیاں سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں نظر آتی ہیں۔ دونوں دس دس روپے کی انگریزی ملازمت سے تحصیل داری اور ڈپٹی کلکٹری پر پہنچے اور سرسید مرحوم کے تعارف اور سفارش سے ۱۸۷۴ء اور ۱۸۷۵ء میں علی الترتیب حیدرآباد دکن میں گورنمنٹ نظام کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ یہ دونوں بزرگ ۱۸۶۴ء اور ۱۸۶۶ء سے قوم کی تعلیمی تحریک میں، جو تمام تحریکات کی بنیاد تھی، سرسید مرحوم کے زبردست معین اور پُر جوش معاون تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی خدماتِ ملی اور احساناتِ قومی کسی طرح فراموش نہیں کیے جا سکتے''۔[۳۴] (دیباچہ: صفحہ نمبر د)۔

ان دونوں بزرگوں کے خطوط بھی اس وقت کی تاریخی اور سماجی صورتِ حال اور خاص طور پر سرسید کے تعلیمی منصوبے کی حمایت اور اس کے فروغ کے سلسلے میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً اُن بزرگوں کے یہ خطوط ملاحظہ ہوں۔

علی گڑھ۔ ۲۱ جنوری ۹۹ء

''جناب من نواب و قار الملک بہادر! ۱۸ جنوری کا عنایت نامہ پہنچا، موعودہ رائے سید محمود صاحب کی غالباً آپ کو یہاں آنے پر مل جائے وہ تو دن رات کام کرتے ہیں اور تمام رات چھاپہ خانہ کھلا رہتا ہے مگر کام ہی اس کثرت سے ہے کہ اس کا انجام پانا ناممکن ہے، آپ کی مدد کی نہایت ضرورت تھی، آپ بھی چل دیے اور آپ سے بھی بوجھ نہ اُٹھ سکا لاچار ہو کر انھیں اپنا بوجھ خود ہی اُٹھانا پڑا۔

آپ کسی طرح آیئے اور جہاں دل ہو وہاں ٹھہریئے (ٹھہریے)

سینہ اس کا ہے دل اس کا ہے جگر اس کا ہے
تیرِ بیداد جدھر رُخ کرے گھر اس کا ہے

آپ نے جو کچھ لکھا ہے پریسیڈنٹی حضرت کے دق کرنے کے لیے کافی ہے یہ بالکل سچ ہے مگر مجھے تو اس میں شبہ ہے کہ سالانہ اجلاس ختم بھی ہو گا یا نہیں اور اس کی رُوئداد بھی تحریر ہو سکے گی کہ نہیں اور اگر تحریر بھی ہوئی تو وہ نافذ بھی ہو گی کہ نہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ اب تک نہ کچھ ہوا اور نہ آیندہ کچھ ہونے کی اُمید ہے اور میں تو آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرا حال اس شعر کے مصداق ہے۔

نے جائے دروں رفتن و نے پائے بروں شد
درماندۂ ایں دائرہ ام ہمچو جلاجل'' ۳۵

باقی عند الملاقات فقط محسن الملک

۱۴ اگست ۱۹۰۴ء

جناب من نواب و قار الملک بہادر! میں بہت خستہ ہو گیا ہوں اور اب محنت اور تکلیف اُٹھانے کے آثار معلوم ہوتے ہیں مگر اب بھی اس قدر کام ہے کہ آرام لینے کے لیے میں بمبئی بھی نہیں جا سکتا، اجلاس ٹرسٹیوں کا ہو گیا۔ جس نے بھٹیار خانے کا شور و غل دیکھا ہو گا اُس کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ مجلس اس سے بہت بڑھی ہوئی تھی، ایسا شور و غل ہوا اور ایسی بے تہذیبی اور بے ہودہ تکرار اور پارٹی فیلنگ کی کارروائی کہ جس کو دیکھ کر نہایت شرم آئی۔ مولوی عبدالماجد کے تقرر کی تحریک پیش تھی۔ صرف مولوی حبیب الرحمن خاں کی مخالفت کی وجہ سے ان کے اقارب نے اختلاف کیا اور نہایت بے ضابطہ اور ناجائز ووٹ پاس کیے یعنی جن ٹرسٹیوں نے کسی قسم کی کوئی رائے نہ دی تھی اور ہمیشہ ایسے ووٹ خارج سمجھے جاتے تھے اس کی نسبت غالب آرا سے یہ رزولیوشن پاس ہوا کہ جو ووٹ خالی ہوں اور ان پر منظوری یا نامنظوری کی کچھ رائے نہ دی گئی ہو وہ نامنظوری میں شمار کیے جائیں تاکہ نامنظوری کے ووٹوں کی تعداد زیادہ

ہو جائے۔ اس بحث کی نوبت تکرار تک پہنچی اور آفتاب احمد خاں صاحب اور حبیب الرحمن خاں صاحب جلسے سے اُٹھ کر چلے گئے اور صرف اسی ناجائز فیصلے سے مولوی عبد الماجد صاحب کا تقرر نامنظور ہوا۔

مولوی صاحب! قوم کی نہایت افسوس ناک حالت ہے، ساری کوششیں بے سُود ہیں، جو لوگ قومی کام میں وقت صرف کرتے ہیں وہ صرف اپنی عادت سے مجبور ہیں ورنہ قوم پر کوئی نمایاں اثر نہیں ہوتا۔ افسوس ہے کہ آپ بہ ضرورت تشریف لے گئے اور جلسے میں شریک نہ ہو سکے ورنہ ایسی کارروائی نہ ہوتی۔

سب سے زیادہ اہم اور ضروری کام قانون کا تیار کرنا ہے براہِ مہربانی اس کام کو طے کر دیجیے اور خدا کے لیے، رسول ﷺ کے لیے اور قوم کے لیے تکلیف گوارا فرمایئے۔ احمد آباد جانے سے پیشتر یہاں تشریف لایئے اور مرزا صاحب کو بھی بلایئے ایک ہفتے میں سب کام ہو جاوے گا ورنہ اس سال بھی رہ جائے گا۔[۳۶]

محسن الملک

نواب وقار الملک کے یہ خطوط ملاحظہ ہوں۔

امروہہ۔ ۲۳ اپریل ۱۸۹۳ء

''جناب قبلہ و کعبہ ام سلامت۔ تسلیم، نوازش نامے نے افتخار بخشا، افسوس ہے کہ سید محمود صاحب کے علی گڑھ تشریف لے آنے کی اطلاع ایسے وقت میں ہوتی ہے کہ مجبوراً مجھ کو اور بھی کچھ عرصہ اُن کی ملاقات میں انتظار کرنا پڑے گا اسی مہینے میں میری منجھلی لڑکی کی شادی ہونے والی ہے۔ ان شاءاللہ تعالیٰ۔

مطبوعہ خطوط آج پہنچ گئے اور اخبار میں وہ مضمون بھی میں نے بہت ہی دل چسپی سے دیکھا جس کی طرف جناب نے اشارہ فرمایا تھا۔ بہت درست ہے صرف دو باتیں اس میں قابلِ عرض ہیں ایک تو یہ کہ مشن اسکول کے تذکرے سے میں نے اتفاق نہیں کیا۔

مشن اسکولوں کی تعلیم کا اثر معلوم نہیں کہ اور غیر عیسائی قوموں پر کیا پڑتا ہے مسلمانوں کی نسبت تو میں کہہ سکتا ہوں کہ علاوہ مذہبی رکاوٹوں اور مذہبی خطرات کے مشن اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم مسلمانوں میں غیرت تو باقی نہیں رکھتی ا۔

دوسرے گورنمنٹ کے کالج و اسکول اگر بالکل نہیں تو بطور دفع الوقتی کے تو ضرور ہمارے لیے البتہ کافی ہوں گے اور مسلمانوں کو اُن مقامات پر جہاں وہ اسکول و کالج ہوں اُسی اور اعلیٰ درجے کی تعلیم کے لیے اُسی پیمانے تک دوسرے کسی انتظام کی اور اس قوت کے منتشر کرنے کی ضرورت نہ ہوگی بہ شرط یہ کہ ان میں ہماری مذہبی تعلیم کا ضروری بندوبست ہو جاوے یعنی وہی اسکیم جو میں نے پیش کی ہے اور وہ تجویز ان شاءاللہ چل جاوے گی اور اس کے

بعد آپ کا یہ مقصد بخوبی حاصل ہو گا اور جو تھوڑا سا خرچ اس اسکیم کے چلانے کے لیے مختلف مقامات پر درکار ہو گا وہ کوئی ایسا بڑا خرچ نہیں ہے جس سے اس کالج کے سرمائے میں کوئی روک پیدا ہو گی بلکہ اُن اسکولوں و کالجوں میں انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم حاصل ہو جانے سے مسلمان طلبا میں ایک قسم کا میلان مدرستہ العلوم کی نسبت پیدا ہو جاوے گا''۔[۳۷] واتسلیم

خاکسار مشتاق حسین

ایک اور خط میں لکھتے ہیں!

امروہہ ۱۹ جنوری ۱۹۱۴ء جناب مخدومی محمد مستجاب اللہ خاں صاحب السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'

۱۶ ماہ کے حال کا الطاف نامہ ورود (وارد) ہوا مشکور فرمایا، میری نسبت حد سے متجاوز

حُسنِ ظن ایک فاش غلطی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم اور یہ اُسی غلطی کا نتیجہ ہے کہ جو آپ کو حال کے ایک موقعے پر اس درجہ رنج برداشت کرنا پڑا لیکن امید ہے کہ اس وقت آپ کو اس بات کا تجربہ بخوبی ہو گیا ہو گا کہ کسی انسان پر حد سے زیادہ اعتماد کرنا مناسب نہیں ہے۔ یہ انبیا علیہم السلام ہی کا درجہ ہے کہ جن کو وحی سے مدد پہنچتی ہے کہ خطاؤں سے محفوظ رہیں۔

اب میں نفسِ مطلب عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم کی حالت نہایت ہی کمزور ہے جو ہر گز بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی قابلیت نہیں رکھتی۔ علی گڑھ کالج سے گورنمنٹ اگر آج اپنی امداد جو مالی اور اخلاقی طور پر اس سے پہنچ رہی ہے روک لے تو آج ہی کالج کا خاتمہ ہے کیا آپ اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ صرف قوم اپنی مالی اور اخلاقی مدد سے اس کو چلا سکے گی۔ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور غالباً نفی میں ہے تو وہ شخص قوم کا گنہ گار ہو گا جو قوم کو ایک ایسے راستے پر چلنے کی ہدایت کرے جس پر چلنے کی قوم میں طاقت نہیں ہے۔ آنریری سکریٹری کے متعلق حال کے موقعے پر جو رائے میں نے قائم کی اس کا بڑا حصہ انہی خیالات پر مبنی ہے۔ افسوس ہے کہ میں آپ کا عنایت نامہ اپنے ذریعے سے کسی اخبار میں بھیجنے سے قاصر ہوں۔

آخر میں بہت زیادہ شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے نہایت سچائی کے ساتھ اپنی رائے سے مجھ کو ممنون کیا۔ میں نے اس قسم کی نکتہ چینی کو ہمیشہ اپنے حق میں ہمدردانہ فعل خیال کیا ہے اور اُمید ہے کہ آیندہ بھی آپ اپنے مفید مشوروں سے جب کبھی موقع ہو گا مجھ کو ممنون فرماتے رہیں گے''۔[۳۸]

خاکسار مشتاق حسین

مشہور شاعر امیر مینائی کے خطوط کے مجموعے مکاتیبِ امیر مینائی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ محمد احسن اللہ خاں ثاقب مدیر قندِ پارسی نے یہ مجموعہء مکتوبات ترتیب دیا اور یہ علی گڑھ سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ شاعری کی طرح امیر مینائی کی نثر بھی فنی و تخلیقی محاسن سے پوری طرح آراستہ و پیراستہ ہے۔ ان کے مکتوبات کے مطالعے سے نہ صرف ان کے خیالات، حالات، مزاج اور طبیعت کے رنگ کا پتا چلتا ہے بلکہ فنِ شعر و ادب سے متعلق ان کے نظریات سے بھی شناسائی ہوتی ہے۔ مثلاً زاہد سہارنپوری کو ایک خط میں (ریاست رام پور مراد آباد، ۳۰ جون ۱۸۹۳ء) لکھتے ہیں کہ !

> ہر زمین کا ایک پیمانہ ہوا کرتا ہے جہاں اس پیمانے سے بڑھ جاتی ہے بد نُمائی آجاتی ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ سنگلاخ زمینوں میں لاکھ کوشش کی جائے مگر مزے دار شعر ایسے نہیں ہوتے کہ سننے والے چٹخارے بھرنے لگیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمھارا سا مزے دار شاعر اپنا وقت ایسی شور و لاحاصل زمینوں میں نہ صرف کرے۔ لوچ دار زمین اختیار کرو تو دیکھو کیا مزا آتا ہے۔[۳۹]

ایک اور خط میں (۲۳ جون ۱۸۹۴ء) زاہد کو تحریر کرتے ہیں کہ !

> آگ لگی والی غزل پر مصرع لگانے کے واسطے تم نے مجھ دل جلے کو تجویز کیا۔ یہ بھی تمھاری طبیعت کی گرما گرمی کا ایک نتیجہ ہے۔ غزل کے گرم ہونے میں کوئی شبہ نہیں مگر بہ نظر اپنے تجربات کے میں جب ایسے شعر دیکھتا ہوں تو میرا دل دھڑکتا ہے۔ وطن میں آگ لگی اور بدن میں آگ لگی اور انجمن میں آگ لگی و قس علیٰ ہذا۔ ایسے شعروں پر میں ہرگز مصرع لگانے کی جرأت نہیں کرتا کوئی اور مختصر سی اچھی غزل میرے واسطے تجویز کر کے بھیجو تو تضمین کا ارادہ کروں۔[۴۰]

محمد احسن اللہ خاں ثاقب دیباچے میں لکھتے ہیں کہ :

> واضح ہو کہ اس مجموعے مکاتیبِ امیر مینائی کی ترتیب ۱۹۰۷ء میں کی گئی تھی مگر خطوط، سوانح اور اسناد کے انتظار میں اب نومبر ۱۹۱۰ء میں بہت کچھ ترمیم اور اضافے کے بعد شائع ہوتا ہے۔ کتاب کا تاریخی نام خطوطِ منشی امیر احمد ہے۔ میرا قصد تھا کہ صرف وہ خطوط کتابی حیثیت میں شائع کیے جائیں کہ جن میں ادب کی رنگینی ہو یا فنِ شعر سے متعلق کوئی نکتہ یا بحث یا کوئی اور بات ہو مگر شمس العلما مخدومی حضرت شبلی دامت افاضتہم نے فرمایا کہ نہیں تمام تحریریں جو مل سکیں بلا ترک و حذف درج کی جائیں کیوں کہ مصنف کے فقرے فقرے اور لفظ لفظ سے اس کے

خیالات، حالات، ذکاوت اور طبیعت کا پتا لگتا ہے پھر ایسے خط جن میں انشا کی رنگینی یا بحثِ فن ہو بہت کم مل سکے بس جو مکاتیب استادِ مرحوم کے مجھ کو بہم پہنچے ہیں وہ سب شائع کیے جاتے ہیں۔[۴۱]

نواب مرزا داغؔ دہلوی اُردو شاعری میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ داغؔ کو زبان کا شاعر کہا جاتا ہے۔ الفاظ اور محاورات کو جس خوبی اور عمدگی سے داغؔ نے اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے وہ کچھ اُنھیں کا حصہ ہے۔ شاعری کی طرح ان کے خطوط بھی اہمیت اور ادبی دل کشی کے حامل ہیں۔ استاد فصیح الملک نواب مرزا داغؔ دہلوی کے خطوط کا مجموعہ زبانِ داغ کے نام سے ان کے شاگرد جناب احسن مارہروی نے ترتیب دینا شروع ہی کیا تھا کہ وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کے بعد ان کے لائق فرزند جناب رفیق مارہروی نے اپنے والد کے اس مشن کو پورا کیا۔ انھوں نے پوری توجہ، محنت اور خلوص سے داغ کے خطوط جمع کیے اور انھیں ترتیب دے کر زبانِ داغ کے نام سے یہ مجموعۂ مکاتیب پیش کیا۔ کتاب پر کوئی سنِ اشاعت تحریر نہیں کیا گیا ہے البتہ پیش لفظ کے آخر میں ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء اور عرضِ مرتّب کے آخر میں یکم دسمبر ۱۹۵۵ء کا سن درج ہے۔ زبان داغ میں انشائے داغ (مطبوعہ ۱۹۴۱ء) کے تقریباً ایک سو چالیس خطوط کے علاوہ سو غیر مطبوعہ اور بہتر خطوط بھی شامل ہیں۔ اس طرح جناب احسن مارہروی اور ان کے بیٹے جناب رفیق مارہروی کی مشترکہ کاوشوں سے داغؔ دہلوی کا ایک بہترین مجموعۂ مکاتیب ہمارے سامنے آیا ہے۔

بقول تمکین کاظمی!

حیدر آباد جیسے مخدوش و پُر آشوب مقام پر بغیر کسی سازش میں شریک ہوئے اٹھارہ سال گزار نا داغؔ اور صرف داغؔ ہی کا کام تھا۔ وہ اُن تمام مکروہات سے محفوظ رہے اور زندگی کی آخری سانسوں تک ان کا شمار جاں نثاروں اور وفاداروں میں رہا اور کوئی سازش ان پر نہ چل سکی۔ حیدر آباد میں بیک بینی و دو گوش یکہ و تنہا آ کر اتنا رسوخ پیدا کر لینا کہ استاد السلطانِ ملکی بن جانا معمولی بات نہیں۔ جس حیدر آباد میں شرر نہ ٹک سکے، محفوظ علی بی اے جیسے قابل نوکری نہ پا سکے وہاں داغؔ جیسے مخصوص رنگ کے حامل شاعر کا پنپ جانا اور پھر اعلیٰ مدارج طے کرنا۔ ع

معجزہ گر نسیت کرامات ہست

داغؔ کی زندگی کن نشیب و فراز سے عبارت تھی اور وہ یقینِ محکم اور عملِ پیہم پر کتنا ایمان رکھتے تھے اس کا اندازہ آپ کو ان خطوط سے ہوگا۔[۴۲]

انشائے داغ کے خطوط میں، جو داغؔ نے زیادہ تر امرا اور نوابین کو لکھے، تصنع اور تکلف کا احساس ہوتا ہے لیکن زبانِ داغ کے خطوط میں، جو داغؔ نے اپنے بے تکلف دوستوں اور شاگردوں کو لکھے، وہ تصنع اور تکلف سے پاک ہیں۔ مثلاًاُن کے یہ خطوط دیکھیے۔

بنام نواب خلد آشیاں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

غریب پرورِ فیض گستر سلامت!

جنابِ عالی۔ فدوی مع الخیر کل بروز سہ شنبہ کو واردِ دہلی ہوا، راہ میں بَشدّت حرارت مراج میں پیدا ہو گئی کہ اب تک ہر بُنِ مُو میں نیشِ زنبور کی کیفیت ہے، آتشِ سوزاں بھڑک رہی ہے۔ آج حکیم محمود خاں سے ملا، بندگانِ عالی کا نہایت سپاس گزار و مداح پایا۔ میرے معالجے کا وعدہ تو کیا ہے آیندہ خدا کے ہاتھ ہے۔ امیدوار ہوں کہ صحت و خورسندی مزاج مبارک سے مطلع ہوں فقط واجب بود عرض نمود۔

الٰہی آفتابِ دولت و اقبال تاباں باد[۴۳]

عرضی فدوی نواب مرزا خاں داغ

معروضہ یازدہم اگست ۱۸۸۰ء

ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ__!

"احسن صاحب! آپ کا خط پہنچا، غزلیں پہنچیں، فرصت میں جواب لکھوں گا۔ نواب خورشید جاہ کے انتقال کا یہاں بڑا صدمہ ہے۔ دو کارڈ آپ کے نام کے آئے تھے وہ ملفوف ہیں۔ یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ سفرِ دُور دَراز کرنا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کئی مہینے آپ کا آنا نہ ہو گا۔ مطبع کو کچھ آپ لکھتے رہتے ہیں یا نہیں۔ گلدستہ تو چھپ کر بٹ بھی گیا، یقین ہے پرچہ تم کو پہنچا ہو گا۔ اخبار پنجہ ء فولاد کو اپنا پتا لکھ بھیجو وہ اخبار یہاں بھیج دیتے ہیں"۔[۴۴]

راقم داغ دہلوی

۳۱ جولائی ۱۹۰۲ء، ترپ بازار، حیدر آباد

بنام نواب سید بہادر حسین خاں انجم نیشاپوری لکھنوی:

میر صاحب مکرم سلامت۔ داغ کو جلا کر خاک میں ملا کر آپ لکھنؤ چلے گئے۔ اے شخص اللہ رے تیرا داغ، چلتے وقت ملنا اور اس تمکنت اس استغنا کے ساتھ، رحم نہ آیا۔ ترس نہ کھایا کہ ایک کشتۂ تیغِ فراق تڑپ رہا ہے اس کی دل جُوئی کیجیے یا اُس کی تلافی یہ ہوئی کہ لو ہم جاتے ہیں۔ اچھا جاؤ غارت ہو، دُہرا صبر کر لیں گے۔ وہ قافلہ لکھنؤ سے

عظیم آباد پہنچا، وہاں سے ایک قیامت نامہ میرے نام آیا جس کا مضمون قابلِ تحریر نہیں۔ جس ساتھ کی میری تصویر سیّد ناظر حسن کو دی ہے اس کے ساتھ کی چند تصویریں اور مجھ کو عنایت ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جو حال آپ نے دیکھا وہ میری کیفیت کسی اور سے نہ کہنا۔ خدا کے واسطے خاک میں نہ ملا دینا۔[۴۵]

راقم مرزا داغ عفی عنہ

۲۰ اپریل ۱۸۸۱ء

بنام مولوی سیّد ابوالحسن ناطق گاؤ ٹھی:

مولوی صاحب۔ آپ کی غزل درست کر کے واپس کی جاتی ہے۔ جس شعر پر چار صاد کیے گئے ہیں یہ مجھے بہت پسند آیا اور یاد ہو گیا۔ شعر یہ تھا:

بگڑ جانے میں بَن آئی ہے شوقِ دید کی کیا کیا
دیا کرتے ہیں جب وہ گالیاں ہم منھ کو تکتے ہیں

یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ ہر شعر میں کسی محاورے کا استعمال کرتے ہیں اور بیشتر کامیابی کے ساتھ مگر اس کا لحاظ رکھیے کہ شعر کے لیے محاورہ آجائے محاورے کے لیے شعر میں سقم نہ آنے پائے اور یہ بھی خیال رہے کہ اس میں تصرف جائز نہیں۔ اگر آسانی کے ساتھ محاورہ بجنسہٖ بحر میں آجائے تو نظم کو دیجیے ورنہ نہیں اور اس کے لیے حضرت اُستاد مرحوم کے کلام پر غور کیجیے کہ اُنھوں نے کس بے ساختگی سے محاورات کو باندھا ہے۔

لفظ جوبن کے متعلق میں پھر کہتا ہوں کہ اس کا استعمال بمعنی ''پستاں'' اہلِ لکھنؤ کی اختراع ہے۔ دہلی والے اس معنی میں نہیں بولتے۔ آپ نے جو مولانا راسخؔ کا شعر پیش کر دیا ہے اُسے میں تسلیم نہیں کرتا۔ خدا جانے وہ کس دُھن میں لکھ گئے۔ مولوی صاحب آپ کے دوست ہیں انھیں سے پوچھیے کہ آپ نے دہلی میں اس لفظ کا ایسا استعمال کہاں سُنا ہے۔ آخر آپ خود بھی تو نواحِ دہلی کے باشندے ہیں اور میرے نزدیک بڑی حد تک آپ کے قصبات کی زبان مستند ہے۔ غور کیجیے کہ کیا وہاں کے شرفا یا عوام میں اس لفظ کا یوں استعمال ہے۔ دہلی کے استعمال میں بھی یہ لفظ ضرور ہے مگر اس طرح:

عجب جوبن برستا ہے کسی سے جب وہ لڑتے ہیں
ادائیں بھی بلائیں لیتی ہیں جس دم بگڑتے ہیں

بہر حال یہ اچھی بات ہے کہ آپ نے محض میرے لکھ دینے پر اکتفا نہ کر کے تحقیق کی طرف قدم بڑھایا۔ یہ وہ جرأت ہے جو ہر نو مشق کو نہیں ہوتی۔ مشقِ سخن کو بڑھایئے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس فن میں کامیاب ہوں گے۔

''حیدر آباد کا ارادہ ہے تو پورا کیجیے، مجھے آپ کو دیکھ کر مسرت ہو گی۔ میرے چوتھے دیوان (یادگارِ داغ) کے زیر ترتیب ہونے کی خبر پایہء ثقاہت سے گری ہوئی ہے کہ آج کل مختلف امراض کا شکار ہوں اور یہ کام تن درستی کا ہے۔ ماہتاب کی ایک جلد آپ کو بھیجنے کے لیے میں نے کہہ دیا ہے''۔[۴۶]

فصیح الملک داغ

حیدر آباد۔ ۴ جولائی ۱۹۰۴ء

عام طور پر اہلِ قلم اپنی تحریر میں کسی خاص اسلوب کے پابند ہوتے ہیں اور وہی ان کی خوبی یا خامی قرار پاتی ہے البتہ غالبؔ اور داغؔ کے یہاں مخاطب کی رعایت سے زبان و بیان کی تبدیلی نے ان کی مکتوب نگاری کو بو قلمونی سے ہم کنار کیا ہے۔ بالخصوص نوابین کو لکھے گئے خطوط کی مقفّٰی و مسجع نثر عمومی مکاتیب میں استعمال کی گئی بے ساختہ اور بے تکلف زبان سے بالکل مختلف ہے۔ اسی لیے غالبؔ کے مکتوباتی اسلوب کی بدولت ایک جداگانہ صنف کی حیثیت سے تشخص پانے والی ''خطوط نویسی'' نے داغؔ دہلوی تک قریباً نصف صدی کے عرصے میں مختلف افکار و رجحانات کے حامل اہلِ قلم کے نامہ جات کی صورت میں ارتقائی سفر طے کیا ہے جس میں سادگی بے تکلفی سے لے کر القاب و آداب سے بوجھل اندازِ تحریر نے اس صنف کو توانائی بخشی ہے اور آئندہ زمانوں کے لیے قواعد و ضوابط کے تعین کے لیے محکم اساس فراہم کی ہے۔

## حوالہ جات:


۱۔ رفیع الدّین ہاشمی، اصنافِ ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۶ء ص ۱۷۷، ۱۷۸
۲۔ مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، مرّتبہ: ، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۵۱ء ص ۲۱۹
۳۔ ایضاً، ص ۳۹
۴۔ ایضاً، ص ۱۱۱
۵۔ ایضاً، ص ۲۶۹، ۲۷۰
۶۔ ایضاً، ص ۴۰۳، ۴۰۴
۷۔ سیّد معین الرّحمٰن، غالبؔ اور انقلابؔ ستاون، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۱۴۴۔
۸۔ ایضاً، ص ۱۶۲
۹۔ ایضاً، ص ۱۴۱
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۲۰
۱۱۔ رجب علی بیگ سرور، انشائے سرور، مطبوعہ: مطبعِ نول کشور، لکھنؤ، بار چہارم، ۱۸۹۸ء، ص ۴۰، ۴۱
۱۲۔ ایضاً، ص ۸۸، ۸۹، ۹۰

۱۳۔ وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام، ترتیب و مقدمہ، انور سدید، مکتبۂ فکر و خیال، ۱۷۲ سنتلج بلاک اقبال ٹاؤن، لاہور، مطبوعہ: ۱۹۸۵ء، ص ۱۳

۱۴۔ خواجہ غلام غوث بے خبر، انشائے بے خبر، مرّتبہ: منشی انتظام اللہ صاحب شہابی، مرتضائی پریس آگرہ، مقدمہ: مولوی حامد حسن قادری، ص: (ج، د)

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، مکتوباتِ سرسیّد، جلد اوّل، مرّتبہ، شعبۂ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۶ء طبع ثانی، ص ۱۱۳، ۱۱۴

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۰۹، ۳۱۰

۱۸۔ سیّد عبداللہ ،اُردو خط نگاری، نقوش، مکاتیب نمبر، شمارہ، ۶۵، ۶۶، مرّتبہ: محمد طفیل، ادارۂ فروغِ اُردو، انارکلی، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۲۸

۱۹۔ نذیر احمد، موعظۂ حسنہ، ہلالی پریس، دہلی، مطبوعہ: ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۲ء، ص ۱۲، ۱۳، ۱۷

۲۰۔ ایضاً، ص: ۱۳۱

۲۱۔ ایضاً، ص: ۱۱۶، ۱۱۷

۲۲۔ افتخار احمد صدیقی، محمد نذیر احمد (آثار و احوال)، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۲۴۳۔

۲۳۔ آغا طاہر، نبیرۂ آزاد، مکتوباتِ آزاد، مرّتبہ: دیباچہ، خواجہ حسن نظامی، کریمی پریس لاہور، ۱۹۰۷ء، ص ۸، ۹، ۱۰

۲۴۔ ایضاً، ص ۴۱، ۴۲

۲۵۔ ایضاً، ص ۱، ۲، ۳

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۱، ۱۲

۲۷۔ محمد امین صاحب زبیری مارہروی، خطوطِ شبلی به نام عطیه بیگم صاحب فیضی و زہرا بیگم صاحب فیضی، مرّتبہ: تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۳۵ء، ص ۶۶

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۰۹، ۱۱۰

۲۹۔ معین الدّین احمد انصاری، شبلی مکاتیب کی روشنی میں، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۲۱

۳۰۔ خواجہ سجاد حسین ، مکتوباتِ حالی حصہ اوّل، مرّتبہ: مقدمہ مولوی عبدالحق، حالی پریس، پانی پت، ۱۹۲۵ء، ص ۷، ۱۳

۳۱۔ ایضاً، ص ۶

۳۲۔ ایضاً، ص ۸۹، ۹۰

۳۳۔ ایضاً، ص ۶

۳۴۔ مکاتیبِ نواب محسن الدّولہ محسن الملک مولوی سیّد مہدی علی خان بہادر منیر نواز جنگ بہ نام نواب وقار الدّولہ وقار الملک مولوی حاجی مشتاق حسین خان بہادر انتصار جنگ، حصۂ اوّل، ترتیب و مقدمہ: محمد امین زبیری مارہروی، (ا، ب، د)، (محمد امین زبیری صاحب کے مقدمے کے آخر میں کوئی تاریخ نہیں درج کی گئی)، شمسی مشین پریس، آگرہ۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۳۸، ۳۹

۳۶۔ ایضاً، ص ۴۲، ۴۳

۳۷۔ ایضاً، ص ۷۳، ۷۴

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۳۹۔ محمد احسن اللہ خاں ثاقب، خطوطِ منشی امیر احمد، اُردو پریس، علی گڑھ، ۱۹۱۰ء، ص ۱۶۷

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۷۷

۴۱۔ ایضاً، ص ۷

۴۲۔ سید رفیق مارہروی، زبانِ داغ، مجموعۂ مکاتیب نواب مرزا داغ دہلوی، پیش لفظ: تمکین کاظمی، مرتبہ، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۵۶ء، ص ۸

۴۳۔ سیّد علی احسن صاحب احسن مارہروی، انشائے داغ، مرتبہ انجمن ترقی اُردو ہند، ۱۹۴۱ء، ص ۱۵

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۴۵۔ ایضاً، ص ۴۸

۴۶۔ ایضاً، ص ۱۲۳، ۱۲۴

**Abstract**

This article focuses on the Urdu literary letters and their rare collections from Mirza Ghalib to Mirza Daagh Dahlavi. Many known literary figures and their letters have also been discussed in between these two renowned poets of Urdu. The article discusses not only the historical perspectives of the letters but it also mentions the biographical details of the writer. The letters of Ghalib paved the way for the style for others to follow. The letters selected in the article had a deep impact on the letters written in the later days. Ghalib's spontaneous expression and delightful reminiscences have always been followed by many letter writers. The letters cited in this article are replete with advices to the novice poets that which words they should select and which to avoid. The literary letters for many of them were a great source for learning the craft of poetry and other writing skills.

**Keywords:** Urdu literary letters, delightful and spontaneous expressions, Ghalib letters